R. N. 2186/57

Regd. No. A 122

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 20

Telegrams: "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ تین روپیہ
ایک پرچہ [illegible]
[illegible]
[illegible]

جلد ۲۱ - شمارہ ۱۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | علی گڑھ - ۸ مارچ ۱۹۶۲ء

ڈاکٹر تارا چند ایم۔ پی

مرزا غالب اور اردو

(انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ دہلی کے زیر اہتمام ۱۵ فروری کو "یوم غالب" منائے جانے کی مختصر خبر یکم مارچ کے "ہماری زبان" میں شائع ہو چکی ہے۔ اس موقع پر جناب ڈاکٹر تارا چند صاحب ممبر پارلیمنٹ نے اپنی صدارت میں مرزا غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جن بیش بہا خیالات کا اظہار کیا اور اردو بولنے اور لکھنے والوں کو جو مشورے دئے ان کے اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

(ادارہ)

غالب کا زمانہ ایک عجیب زمانہ تھا۔ ۱۸۵۶ء میں دلی کی ناگفتہ حالت تھی اور ۱۸۵۷ء میں وہ عظیم انقلاب ہوا جس نے ہندوستان کو ایک طویل عرصے کے لیے غلام بنا دیا۔ لیکن مرزا غالب کی شہرت ان کی وفات کے بعد دن بہ دن زیادہ ہوتی گئی اور آج جبکہ دنیا بڑی تیزی سے بدل رہی ہے غالب کے فن کی آب و تاب جوں کی توں ہے اور ان کے کلام کو قبول عام کا درجہ حاصل ہے۔ حالانکہ اس پر فارسی کا اثر زیادہ ہے۔ فارسی غالب کے زمانے میں حکومت کی زبان تھی وہ نسلاً تورانی تھے اور ان کے آبا و اجداد کی زبان فارسی تھی اس لیے ان کی اردو شاعری کی بنیاد بھی فارسی تراکیب پر ہے اور ان کے ابتدائی دور کے اردو کلام میں تو فارسیت بہت زیادہ ہے جو ادیب جس زمانہ میں ہوتا ہے وہ اس زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ غالب کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ انھوں نے وہ شہنشاہی دور بھی دیکھا جب اردو ادب کی حیثیت درباری تھی لیکن اردو کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بادشاہوں کی منظور نظر رہی اور درباری محلوں میں پلی بڑھی صحیح نہیں ہے۔ زوال سلطنت ہونے تک سرکاری زبان فارسی تھی۔ بڑے لوگ اردو کو زیادہ منہ نہیں لگاتے تھے۔ اس زمانہ میں تمام خط و کتابت پڑھے لکھے اصحاب فارسی میں کرتے تھے۔ لشکر کے لوگ، بازار والے اور نچلے طبقے کے کام پیشہ اردو بولتے تھے۔ غالب نے اردو خطوط نگاری کی سب سے پہلے طرح ڈالی۔ اس طرح اپنی نثر میں وہ عوام سے بہت قریب آ گئے۔

اس ملک کا مزاج ایسا ہے کہ یہاں ہمیشہ دو زبانیں رہی ہیں۔ جب سنسکرت سرکاری زبان تھی تو پراکرت کو عوام میں مقبولیت حاصل تھی اور جب حکومت کی زبان فارسی تھی تو آپس میں میل جول قائم کرنے کے لیے اور لین دین کے واسطے عوام نے ایسی زبان بنائی جس میں فارسی بھی شامل تھی، سنسکرت بھی اور ترکی بھی تھی عربی بھی۔ اس کی نیو برج بھاشا اور کھڑی بولی پر رکھی گئی۔ چونکہ اس کی ابتدا لشکر میں ہوئی تھی اس لیے اس کو اردو کا نام دیا گیا۔

غالب نے پہلے اردو میں کچھ عرصے تک شعر کہے پھر ان کا رجحان فارسی کی طرف ہو گیا۔ آخری دور کا ان کا اردو کلام بہت صاف اور سلیس زبان میں ہے اور جیسا میں نے پہلے کہا خطوط نگاری میں غالب کا اپنا انفرادی رنگ ہے۔ غالب کا یہ اردو پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اردو کو وہ تاب و توانائی اپنی نظم و نثر میں بخشی کہ اردو بھی ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے لائق ہو گئی۔ نقادوں نے کہا ہے کہ غالب کا زمانہ یاسیت اور قنوطیت کا زمانہ ہے۔

چوں کہ اس دور میں ہندوستان پر ادبار و نکبت کی گھٹائیں چھائی تھیں اور افراتفری کا عالم تھا۔ اسی لئے غالب کی شاعری پر حزنیہ کیفیت چھائی ہوئی ہے لیکن ان کی فطری شوخی اور طبعی شگفتگی نے ان کے کلام کو نوحہ نہیں بننے دیا۔

میری ناچیز رائے میں اگر کوئی زبان ہر تقاضا کو پورا کر سکتی ہے تو وہ غالب کی زبان ہے۔ لوگ کہتے ہیں اردو کی کیا ضرورت ہے ہندی والوں کے لئے بھی دو زبانیں ہیں۔ ایک سرکاری اور دوسری غیر سرکاری پندرہ برس میں کسی سماج کی کایا پلٹ نہیں ہو سکتی۔ ہندی والوں کی یہ زبردستی کہ اردو کا نام و نشان مٹا دیا جائے بہت بڑی غلطی ہے۔ ہم لوگوں کو سوچ کر فیصلہ کرنا ہے کہ ہماری کیا زبان ہوگی۔

اسی زبان کو تو ہم اپنا سمجھیں گے جو ہم بولتے ہیں۔ ناموں سے کیا ہوتا ہے چیز کو دیکھنا چاہئے۔ غالب نے بھی اردو کو ہندی کا نام دیا ہے اردو کے لئے تو یہ اچھا ہے کہ وہ ہمیشہ کی طرح عوامی زبان رہے حکومت کے بوجھ سے بچی رہے۔ ہماری اردو زبان صوفیوں، درویشوں فنکاروں اور عوام کی زبان ہے۔ اس لئے اس کو ہر دلعزیزی کا درجہ حاصل ہے اور اس کے مقابلے میں ہندوستان کی کوئی زبان نہیں اسکتی اس زمانہ میں بھی ہماری سرکاری زبان ہندی ہے تو اردو قومی زبان ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اردو بولنے والے اس کو زیادہ سے زیادہ عوامی رنگ دیں۔ زندہ زبانیں صرف دعویٰ کرنے سے نہیں بنتیں ان میں تو آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور اردو میں تو اخذ کرنے کی بہت قوت ہے۔ ہر زبان کا لفظ اس زبان میں آکر انگوٹھی میں نگینے کی طرح بیٹھ جاتا ہے میں نے حیدرآباد میں اردو کانفرنس کے موقع پر دیکھا کہ اردو کے لئے وہاں لوگوں کے دلوں میں کتنی محبت ہے۔ آندھرا صوبہ کے بہت سے لوگ کانفرنس میں شریک تھے۔ وہاں تقریریں بھی ہوئیں اور شعر بھی پڑھے گئے۔ وہاں کے مقامی اثرات اردو نے لئے ہیں اسی لئے جہاں بھی اردو بولی جاتی ہے اس جگہ کے مزاج کے مطابق ہو جاتی ہے یہ بات ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ باہر کے ملکوں میں بھی ہے۔ ایران میں جو زبان آج کل لکھی جا رہی ہے وہ بالکل عوامی ہے اور ہم لوگ جنھوں نے پرانی فارسی پڑھی ہے اس زبان کو سمجھ نہیں پاتے۔ اردو عوام کی زبان ہے میں زبان کو ایک ذریعہ سمجھتا ہوں کام کرنے کا ماحول کے مطابق زبانوں میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اردو زبان کے علاوہ اور کسی زبان میں ایسا زور نہیں جو دلوں پر اس طرح اثر انداز ہو۔ ہندی ہو یا اردو دونوں زبانوں کے لکھنے والوں سے میری درخواست ہے کہ وہ کوشش کریں کہ ان کی لکھی ہوئی چیزیں عوام سمجھ سکیں۔ ہندی کی بھی حالت یہ ہے کہ میں ہندی داں ہونے کے باوجود راجیہ سبھا کی اکثر رپورٹیں سمجھ نہیں سکتا۔ غالب کو آخر میں پھر خراج عقیدت پیش کرتا ہوں ان جیسا فنکار ہندوستان میں پیدا ہوا یہ اس ملک کی خوش نصیبی ہے ورنہ غالب نے اپنے فن کی بدولت شہرت دوام کا خلعت حاصل کیا اور ان کی شاعرانہ عظمت اس وقت پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ بیرونی ممالک کے اکثر لوگ اپنی ملکی زبانوں میں ان کے کلام کا ترجمہ کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند

ہندی انگریزی الفاظ اور اُردو املا

۸ر دسمبر ۱۹۶۰ء کے ہماری زبان میں جناب ایم اے حسن پھنروی کا ایک فکر انگیز مضمون "ہندی کے ماترا اور اردو کے اعراب" کے عنوان سے شائع ہوا۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ادارہ نے اس پر اظہار خیال کا صلائے عام دیا۔ اس کے جواب میں حسب ذیل شماروں میں مضامین یا مراسلے شائع ہوئے

جناب ایم اے حسن پھنروی ۸ر دسمبر ۶۰ء۔ ۱۲ر جون ۶۱ء
یکم ستمبر ۶۱ء۔ ۱۵ر جنوری ۶۲ء

جناب غلام رسول حیدرآباد ۱۵ر جولائی ۶۱ء۔ ۲۲ر اگست ۶۱ء
۲۲ر ستمبر ۶۱ء

ڈاکٹر منصور الدین قریشی ۸ر فروری ۶۱ء

عبدالودود ایم اے یکم دسمبر ۶۱ء

اس موضوع کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ترقی اردو بورڈ پاکستان نے اردو میں ہندی اور انگریزی الفاظ کی کتابت کے بارے میں ایک املانامہ شائع کیا ہے جس میں ۲۱ تجویزیں ہیں۔ ان پر غلام رسول صاحب نے اگست ۶۱ء کے رسالہ معارف میں تبصرہ کیا۔ میری نظر سے املانامہ نہیں گذرا۔ لیکن غلام رسول صاحب کے تبصرہ میں بورڈ کی جملہ تجاویز سامنے آگئی ہیں۔ جناب حسن پھنروی اور غلام رسول صاحب نے بچوں کی ابتدائی جماعتوں کو اردو پڑھانے میں ایک عمر صرف کی ہے۔ اپنے مدت العمر کے تجربے اور اُردو کی ترقی کے جذبے کے تحت بڑے پُرخلوص انداز میں کچھ اصلاحیں تجویز کی ہیں۔ حسن صاحب کی تجاویز کا نچوڑ ۲۲ر جون ۶۱ء کے ہماری زبان میں ہے اور غلام رسول صاحب کا موقف ۲۲ر اگست ۶۱ء کے شمارے میں واضح کیا گیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تفصیل ان کے کتابچہ اردو املا نامہ (ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد) میں ملتی ہے۔

اردو رسم الخط میں دو بڑی خامیاں ہیں۔ ایک تو زبانوں کے تنازع البقا میں وہ ٹائپ اور چھاپے کے نئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ دوسرے یہ کہ تحریر تلفظ کی صحیح نمائندگی نہیں کرتی، خصوصاً بعض ہندی الفاظ کا صحیح املا نہیں ہو پاتا۔ اصلاح روز روز اور بار بار تو ہوتی نہیں، جو اصلاح دونوں پہلوؤں کو پیش نظر نہ رکھے وہ ناقص ہے۔ زیر نظر بحث میں عموماً دوسرے پہلو کو پیش نظر رکھا گیا ہے گویا دستی تحریر اور لیتھو ہی کو سامنے رکھ کر ہمارے رسم الخط میں چند تبدیلیاں تجویز کی گئی ہیں میں بھی اسی حصار میں پابند رہ کر اس بحث کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ انفرادی تجاویز فکر انگیز ضرور ہوتی ہیں، راستہ ضرور دکھاتی ہیں لیکن ان کے قبول کئے جانے کی کوئی توقع نہیں۔ رسم الخط کی اصلاحیں اسی وقت چلن میں آسکتی ہیں

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

ہماری زبان

۸ مارچ ۱۹۶۲ء

رانچی یونیورسٹی اور ذریعہ امتحان

رانچی یونیورسٹی حال میں قائم ہوئی ہے۔ جب کوئی نیا ادارہ وجود میں آتا ہے تو یہ وقت بڑا نازک ہوتا ہے اگر ابتدا میں کوئی غلط قدم اٹھایا گیا تو عرصے تک اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ نیا اقتدار کچھ لوگوں کو من مانی کرنے کی تحریک دلاتا ہے۔ اگر اتفاق سے طاقت کے نشے میں کسی ذہنی یا اصلی قومی مفاد کا شائبہ نکلتا ہو تو پھر کریلے اور نیم چڑھے کی مثل صادق آتی ہے۔ رانچی یونیورسٹی نے یہ نادری حکم جاری کیا ہے کہ جن طلبا کی مادری زبان بنگالی، اردو اور اڑیا ہے وہ بھی ۱۹۶۲ء کے امتحان سے سوالوں کا جواب ہندی میں دیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے الیکشن کے دورے میں ہر جگہ اعلان کرتے پھرے کہ ہم سب کے لئے یکساں مواقع فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ ماہرین تعلیم پکار رہے تھے کہہ رہے ہیں کہ مادری زبان کو اصولاً ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے۔ اور ذریعہ تعلیم فوراً نہ ہو سکے تو امتحان کا ذریعہ تو ہو۔ حکومت ہند اور حکومت بہار کی پالیسی یہ ہے کہ لسانی اقلیتوں کو ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جائے اور رانچی یونیورسٹی کے ارباب اختیار ہندی نوازی کے جوش میں ان سب باتوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ چھوٹا ناگپور کئی زبانوں کا علاقہ ہے۔ اسٹیٹس مین کے ایک مکتوب نویس کے قول کے مطابق وہاں پانچ فی صدی سے زیادہ لوگوں کی زبان ہندی نہ ہوگی۔ مگر رانچی یونیورسٹی اپنے علاقے کی زبانوں کو نظر انداز کر کے ہندی کو لازمی طور پر امتحان کا ذریعہ بنانا چاہتی ہے۔ اس عمل پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ اپنی دانست میں یہ ہندی کی خدمت کر رہی ہے۔ حالانکہ دراصل ہندی کے حق میں کانٹے بو رہی ہے۔ اس طرح زبردستی کر کے ہندی اس علاقے میں مقبول نہیں ہو سکتی۔ پھر اقلیتوں کو بددل اور غیر مطمئن کر کے ترقی کا خواب دیکھنا دانش مندی سے بعید ہے۔ یونیورسٹی کو چاہیے کہ اپنے اس حکم کو فوراً واپس لے اور ذریعہ تعلیم اور ذریعہ امتحان کے معاملے میں تعلیمی اصولوں اور حقائق کے مطابق فیصلہ کرے۔ آزادی کے پندرہ برس کے بعد تو یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ ذمہ دار اشخاص ذہنی بلوغت کا ثبوت دیں گے۔

الیکشن اور اردو

ہندوستان کا تیسرا الیکشن ختم ہو گیا۔ ہمارے پاس جو خبریں پہنچی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ قریب قریب ہر پارٹی نے اردو کا استعمال کیا۔ بعض علاقوں میں ووٹروں کی فہرستیں اردو میں چھپیں۔ پوسٹروں، اپیلوں میں شاندار الفاظ میں امیدواروں نے اپنے اپنے حقوق کا اعلان کیا یا اپنی پارٹی کی پبلسٹی کی۔ کچھ لوگ چاہے کچھ کہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ انتخاب کے وقت اردو کی اہمیت کا دوست دشمن سب کو احساس ہو جاتا ہے۔ یہ بات اب اچھی طرح ثابت ہو گئی ہے کہ اردو کا چلن صرف تین چار ریاستوں تک محدود نہیں بلکہ قریب قریب ہر ریاست میں اس سے کام پڑتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس حقیقت کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے اور اردو کے حقوق کا ہر طرح تحفظ کیا جائے۔ ایسا کرنے میں کسی زبان کے حقوق کو نظر انداز نہ کرنا پڑے گا۔ ہاں اردو کے لئے مزید انتظامات کی ضرورت ہوگی۔ پنجاب کی معرکہ آرائی ہو یا دہلی کی کشمکش، اترپردیش کی جدوجہد ہو یا بہار کی انتخابی مہم سب میں اردو نمایاں تھی۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کا چراغ گل ہو رہا ہے، وہ دیکھیں کہ اس انتخاب میں اردو سے کیا کیا کام لئے گئے ہیں پھر انھیں اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔ حکومت کا فرض ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر کے مناسب قدم اٹھائے۔ اس انتخاب نے اردو کی قومی حیثیت پر ایک اور مہر لگا دی ہے۔

شری کالیشور راؤ کی وفات

یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۲۶ فروری کو شری ویا ناؤ کالیشور راؤ اسپیکر آندھرا اسمبلی اس دنیا سے گزر گئے۔ وہ ۲۲ جنوری ۱۸۸۱ء کو پیدا ہوئے تھے اور انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۱ سال کی تھی۔ مسٹر کالیشور راؤ کی وفات نے آندھرا کی ریاست کو ایک آزمودہ کار رہنما، مشترکہ تہذیب کے ایک بڑے علم بردار اور ایک بڑی اردو دوست کی خدمات سے محروم کر دیا۔

مسٹر کالیشور راؤ جو کئی سال تک آندھرا یونیورسٹی کی سینٹ اور سنڈیکیٹ کے رکن رہ چکے تھے کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ تلگو زبان میں ان کی کتابیں ذکر کرتا ہیں، انقلاب فرانس، جمہوری ترکی، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، چین کی قوم پرست تحریکیں، مصر اور ہندوستان کا سبق وغیرہ۔ مسٹر کالیشور راؤ آندھرا ہندی پرچار سنگھ کے نائب صدر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے قیام آندھرا پردیش کے بعد ہندی اور اردو کی ترقی میں بھی سرگرمی سے دلچسپی لی تھی چنانچہ آندھرا پردیش اکیڈمی آف سائنس و تاریخ بھی ان ہی کی کوششوں سے قائم ہوئی تھی جو اردو اور تلگو میں کتابیں شائع کرتی تھی۔

حمید نظامی کا انتقال

ہندوستان کے صحافتی حلقوں میں یہ خبر رنج کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۲۵ فروری کو نوائے وقت (لاہور) کے ایڈیٹر حمید نظامی کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم پاکستان کے کم عمر مگر پختہ کار اور مشہور صحافی تھے۔

شکسپیئر کے ڈرامے عربی میں

مشہور ڈرامہ نگار ولیم شکسپیئر کے ڈراموں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ یہ منصوبہ عرب لیگ نے متحدہ عرب جمہوریہ کے مشہور مصنف طٰہٰ حسین کی تحریک پر تیار کیا ہے۔ موصوف نے اس سے پہلے مشہور یونانی تمثیل نگار سوفوکلیس کی تحریروں کا بھی عربی میں ترجمہ کیا ہے اور آپ کی نسل کے متعدد المیوں کو عربی میں منتقل کر چکے ہیں۔ شکسپیئر کے ڈراموں کے عربی تراجم کی چھ جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔ ہر جلد میں دو ڈرامے شامل ہیں۔

عرب لیگ نے اس کے علاوہ متعدد قدیم یوروپی کلاسیکی ادب پاروں کو عربی میں منتقل کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ ان میں یونانی شاعر ہومر کی "الیڈ" قابل ذکر ہے۔

ہندوستان کے لئے کم قیمت کی کتابیں

حکومت برطانیہ نے ایشیائی ملکوں کو کم قیمت کی کتابیں مہیا کرنے کی جو اسکیم بنائی ہوئی ہے اس کے تحت یونیورسٹیوں کی نصاب کی کتابوں کے علاوہ نو دیگر کتابیں بھی چھاپی گئی ہیں۔ یہ کتابیں ان ملکوں کو بھیجی جا رہی ہیں یا جلد بھیج دی جائیں گی۔

کتابوں کی قیمت اُن کی اصلی قیمت کی تقریباً ایک تہائی کے برابر ہے۔ ان میں انگریزی کی ڈکشنری و گرامر، ایک میڈیکل ڈکشنری اور انگریزی الفاظ کے استعمال سے متعلق دو کتابیں شامل ہیں۔ جو ممالک ان کتابوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ان کے نام یہ ہیں:- ہندوستان، سیلون، افغانستان، برونئی، برما، ہانگ کانگ، انڈونیشیا، ملایا، نیپال، شمالی بورنیو، پاکستان، ساراوک، سنگاپور، تھائی لینڈ اور ویٹ نام۔

دنیا کا بہترین ٹیلی وژن سسٹم

برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک بین الاقوامی مقابلہ کا اہتمام کیا تھا۔ اس مقابلہ کے ابتدائی نتیجہ میں متحدہ عرب جمہوریہ ٹیلی وژن کو دنیا کے پانچ بہترین ٹیلی وژن سسٹموں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بی بی سی نے ماہرین کی ایک ٹیم کو ان پانچ ٹیلی وژن سسٹموں کا معائنہ کرنے کے لئے مامور کیا تھا۔ ان ماہروں نے تمام سسٹموں کا معائنہ کرنے کے بعد قرار دیا کہ متحدہ عرب جمہوریہ کا ٹیلی وژن سسٹم دنیا کے دوسرے تمام سسٹموں سے بہتر ہے اور دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کا ٹیلی وژن اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بی بی سی نے اس مقابلہ کے آخری نتیجہ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ متحدہ عرب جمہوریہ کے ٹیلی وژن سسٹم سے جو پروگرام نشر کئے جاتے ہیں وہ بہت ہی شاندار اور مختلف موضوعوں کے حامل ہوتے ہیں اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ کا ٹیلی وژن سسٹم صرف ۱۸ مہینے پہلے شروع کیا گیا تھا۔ لیکن اس نے اس قدر ترقی کی ہے کہ اب اس کے پروگرام ہر روز ۲۰ گھنٹے نشر ہوتے رہتے ہیں۔

۸۰ ہزار کتابوں کی ایک جدید لائبریری

مغربی برلن۔ (ڈاڈ) ــــ مغربی برلن کی حکومت نے ان ہی دنوں میں "پروشین سرکاری لائبریری" کو از سر نو تعمیر کرنے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس عمارت کی تعمیر پر ایک کروڑ ۲۵ لاکھ ڈالر صرف ہوں گے اور یہ اپنے جدید طرز، وسعت اور آراستگی کے اعتبار سے دنیا بھر میں مثالی حیثیت کی مالک ہوگی۔

اس لائبریری کی وسیع عمارت میں عوام کی تمام تر ضروریات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ متعدد ریڈنگ روم، لیکچروں کے کمروں اور نمائش کے کمروں کے علاوہ اس عمارت میں فن لائبریری کی ایک تربیتی درس گاہ بھی ہوگی۔ ملازمین اور ہر آنے والے شخص کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک جدید طرز کا ریسٹورانٹ اور قہوہ خانہ بھی اس وسیع منصوبے میں شامل کیا گیا ہے۔ اس جدید طرز کی لائبریری کا دلچسپ حصہ کتابوں کی تقسیم سے متعلق ہے۔ مستقبل میں ہر ممبر کو انتظار کی الجھن سے بچانے کے لئے آٹومیٹک طریقے پر کتابیں حاصل کرنے کا طریقہ رائج کیا جاوے گا جس کے ذریعہ چند منٹ کے اندر ہر شخص اپنی مطلوبہ کتاب حاصل کر سکے گا۔

اتر پردیش میں خط و کتابت کے ذریعہ تعلیم دینے کی اسکیم

یو۔پی۔ اسمبلی میں وزیر تعلیم اچاریہ جگل کشور نے ایک نئی تعلیمی اسکیم کا انکشاف کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ کام کاج میں مصروف رہنے کے باعث یا دور رہنے کی وجہ سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے ان کے لئے شام کے وقت والے کالج کھولے جائیں اور خط و کتابت کے ذریعہ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

وزیر تعلیم نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ حکومت ہند نے یہ اسکیم تیار کی ہے اور ریاستی حکومت نے اس کے بارے میں ضروری اطلاعات فراہم کر لی ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ شام کے وقت تعلیم دینے والے ایسے ہر کالج میں ۱۰۰ طلبا کے لئے انتظام ہوگا جہاں ڈگری کورس دو سال میں پورا کیا جاتا ہے وہاں اس کی مدت تین برس کر دی جائے گی اور جہاں اس کی مدت تین برس ہے وہاں اسے چار برس کر دیا جائے گا۔ خط و کتابت کے ذریعہ تعلیم دینے کی اسکیم سے ان لوگوں کو فائدہ پہونچے گا جو یونیورسٹیوں سے دور رہتے ہیں اور باقاعدگی سے یونیورسٹی نہیں جا سکتے۔ شروع میں کچھ یونیورسٹیاں خط و کتابت کے ذریعہ تعلیم دینے کی اسکیم شروع کریں گی اور اس کا نصاب تعلیم مختصر ہوگا۔ اسکیم کے مطابق ایسے طلبا کے لئے یونیورسٹیوں میں لائبریری کا ایک حصہ مخصوص کر دیا جائے گا جہاں سے انھیں ضروری کتابیں آسانی سے مل سکیں گی۔ ان طلبا کے لئے تعطیلات میں بھی پڑھائی کا انتظام رہے گا۔ ہر یونیورسٹی میں ۲ ہزار طلبا داخل کئے جائیں گے۔ جہاں ڈگری کورس ۳ برس کا ہے وہاں خط و کتابت کورس ۵ برس کا ہوگا اور جہاں کورس ۲ برس کا ہے وہاں ۴ برس کا ہوگا۔

احمد ندیم قاسمی

تین سرزمینیں

سرزمینِ دل پہ ماضی کے رواں ہیں کارواں
چار سُو آراستہ ہیں کتنی یادوں کے نشاں

اک طرف چہرے، کتابوں کی طرح رازوں بھرپُر
اک طرف تیور، تقاضے — اک طرف آنکھیں، زباں
اک طرف جلتے ہوئے ہونٹوں کی شمعیں شعلہ بار
اک طرف اُڑتا ہوا گیسوئے مشکیں کا دھواں
اک طرف صرف ایک چٹکی میں گذرتے رات دن
اک طرف وہ پل، کہ غش کھا جائے عمرِ جاوداں
اک طرف ہے وسعتِ گیتی، مگر محصور ہے
اک طرف ہے حلقۂ آغوش، لیکن بیکراں

☆

سرزمینِ ذہن پر ہیں حال کے لشکر رواں
چار سُو آراستہ ہیں کتنے زخموں کے نشاں

اک طرف اُمید کے پیڑوں پہ بور آیا ہوا
اک طرف گھرتی، اُمنڈتی، دندناتی آندھیاں
اک طرف ڈرتے عقیدے، اک طرف مرتے یقیں
اک طرف صف بستہ، ملبوسِ حقیقت میں گماں
اک طرف دشمن کو بھی دشمن پہ پیار آیا ہوا
اک طرف نفرت کے نرغے میں خلوصِ دوستاں
اک طرف انسان خود اپنی نظر میں اجنبی
اک طرف ذروں کی مریخ و زحل سے شوخیاں

☆

سرزمینِ حال پر ہے روحِ مستقبل رواں
چار سُو آراستہ ہیں کتنے خوابوں کے نشاں

اک طرف ویران رستوں پر چہکتے ہم سفر
اک طرف ملبے کے ڈھیروں پر مچلتی کہکشاں
اک طرف افراد کے رشتوں میں آہنگِ نسیم
اک طرف قوموں کی باتوں میں گلوں کی نرمیاں
اک طرف تارے، عروجِ آدمی کے منتظر
اک طرف گھر کی منڈیروں پر حدودِ لامکاں
اک طرف حسن و محبت، اک طرف تقدیس و خیر
اک طرف صرف آدمیت، اک طرف ہفت آسماں

غزل

اکمل حیدرآبادی

دل ہے اسیرِ گردشِ دوراں ترے بغیر　　عالم مری نظر میں ہے زنداں ترے بغیر
تو رو برو نہ ہو تو کہاں لطفِ میکشی　　میخانۂ حیات ہے ویراں ترے بغیر
اکمل اسیرِ جذبۂ فرقت تو ہی نہیں　　وہ بھی ہیں بیقرار و پریشاں ترے بغیر

طلعت رضوی برقی

مچل رہا ہے اک اک پھول رنگ و بو کیلئے　　پکارتی ہے زمینِ چمن لہو کیلئے
وہ آنکھ پھیر کے اب پاس سے گذرتے ہیں　　جو چھیڑتے تھے کبھی خود سے گفتگو کیلئے
ہزار شوق کی شمعیں نظر میں رقصاں ہیں　　جو دل میں حسرتیں بیچین ہیں نمو کیلئے
کہاں سناؤں میں اشعار دل پذیر اپنے　　مشاعرہ تو ہے اے برق خوش گلو کیلئے

اجمل خاں نجیب آبادی

دل پہ غم کا بار ہے ساقی　　گل بھی نظروں میں خار ہے ساقی
کاوشِ تلخیٔ حیات نہ پوچھ　　دل بہت بیقرار ہے ساقی
خلق حیرت سے دیکھتی ہے مجھے　　بے پئے وہ خمار ہے ساقی

سعید یوسف شاد بسمل

ترا غم جہاں تھا وہیں کا وہیں ہے　　وہ نشتر رگِ جاں کے اب بھی قریں ہے
یہی ہے کمالِ جنون و محبت　　وہ ہیں پاس پھر دل ملول و حزیں ہے
جو سینے میں طوفاں اٹھاتی تھی بسمل　　ترے شعر میں بات اب وہ نہیں ہے

رشید جعفری

تھم گئے جب سے یہ ماحولِ شبستاں چپ ہے　　ظلمتیں پھیل گئیں شمع فروزاں چپ ہے
کیا ادھر سے کسی دیوانے کی میت نکلی　　اشک آلود ہے ہر پھول گلستاں چپ ہے
چل بسا دہر سے اک رندِ بلانوش رشید　　میکدہ سونا ہے اور بزمِ نگاراں چپ ہے

ارشد صدیقی

شعاعِ مہر کا شک بھی بہت غنیمت ہے　　شبِ الم یہ جھلک بھی بہت غنیمت ہے
جو گونج اٹھتی ہے تنہائیوں کے لمحوں میں　　وہ پائلوں کی چھنک بھی بہت غنیمت ہے
غمِ حیات کے اس دورِ ناشناسی میں　　تری ہنسی کی چھلک بھی بہت غنیمت ہے
سکوتِ شب کو اگر توڑ دے تو اے ارشد　　کلی کی ایک چٹک بھی بہت غنیمت ہے

ناظم میواتی سہرامی

آہ ہوتی ہے بے اثر لیکن　　اتنی بھی بے اثر نہیں ہوتی
ان کو میری خبر تو ہے ناظم　　مجھ کو ان کی خبر نہیں ہوتی

معین کوثر

فزوں کچھ اور الجھن ہو گئی اس زلفِ برہم سے　　سنا تھا اس کے سائے میں ذرا آرام آتا ہے
زمانہ ہو گیا ترکِ تعلق کو مگر کوثر　　چھلک پڑتی ہیں آنکھیں جب کسی کا نام آتا ہے

بقیہ ہندی انگریزی الفاظ اور اردو املا

جب کوئی اہم ادارہ ان کے پس پشت ہو۔ رسم تحریر کے معاملے میں زمانے کی قدامت پسندی کے پیش نظر میں انقلابی تجاویز کو بے سود سمجھتا ہوں فی الحال وہی اصلاحیں قابل قبول ہو سکتی ہیں جو رسم خط کے موجودہ چہرے مہرے کو برقرار رکھیں حسن صاحب کی رائے کہ طباعت اور ٹائپ کی سہولت کے پیش نظر اردو الفاظ کے ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ لکھا جائے اور ڈاکٹر منصور الدین قریشی کا مشورہ کہ اردو میں حرف علت کے لئے ہندی کی تمام ماتراؤں کو جوں کا توں اختیار کر لیا جائے ایسی ہی انقلابی تجویزیں ہیں جن کے قبول کئے جانے کا سردست کوئی امکان نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک زبان کا رسم خط اپنی زبان کے الفاظ ہی کے لئے موزوں ہوتا ہے جب تک اس میں مناسب تبدیلیاں نہ کی جائیں وہ دوسری زبان کے تمام الفاظ کو پوری صحت کے ساتھ ادا نہیں کر سکتا۔ رومن رسم خط میں ہندی الفاظ اور ناگری رسم خط میں انگریزی الفاظ کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ اس سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ ایک رسم خط کم از کم اپنی زبان کے الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کرنے پر اس طرح قادر ہو کہ سوا صحیح قرأت کے کوئی دوسرا تلفظ ممکن نہ ہو۔ اس تقاضے کو بھی سو فی صدی پورا نہیں کیا جا سکتا۔ تلفظ کو مکمل صحت کے ساتھ ادا کرنے کا مدعی صرف بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط ہے لیکن وہ اس قدر پیچیدہ اور مفصل ہے کہ روزانہ کی ضروریات کے ڈھب کا نہیں۔

گویا بہت سائنٹفک ہونا بھی کوئی نعمت نہیں۔ ہمارا نصب العین محض یہی ہونا چاہیے کہ ہمارا رسم الخط ایک بڑی حد تک ہمارے الفاظ اور دوسری زبانوں کے ان الفاظ کو جن سے ہمیں سابقہ پڑتا رہتا ہے صحت کے ساتھ پیش کر سکے رسم الخط میں اصلاح تجویز کرنے کے لئے صوتیات کی کم از کم ابتدائی معلومات ناگزیر ہیں ورنہ چند غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش میں بعض اور زیادہ فاحش اغلاط کے رونما ہونے کا امکان ہے

ایم اے حسن صاحب نے ہندی کے انوسوار یعنی نون غنہ یا وصلی نون اور وسرگ (:) کو بھی حرف علت میں شامل کر لیا ہے حالانکہ یہ حروف صحیح ہیں اور سنسکرت اور ہندی میں انھیں کبھی حرف علت نہیں مانا گیا۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر منصور الدین قریشی کے توجہ دلانے کے بعد بھی حسن صاحب ۲۲ جون ۱۹۷۱ء کے ہماری زبان میں ان آوازوں کو حرف علت کہنے پر مصر ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ بھی عجیب ہے کہ اردو میں ہندی سے زیادہ حرف علت ہیں۔ اردو اور ہندی لسانیات کے نقطۂ نظر سے ایک زبان ہیں۔ ان دونوں کے حروف علت میں فرق ہونا ممکن ہی نہیں۔ حسن صاحب نے آم کی پہلی آواز کو جامہ کی آخری آواز سے مختلف قرار دیا ہے۔ حالانکہ جامہ میں بھی وہی الف ممدودہ کی آواز ہے جو آم میں ہے۔ اصوات کا تعین کرتے وقت صرف تلفظ ذہن میں رکھئے۔ رسم الخط کی

جو املیوں کو بھول جائیے۔ حسن صاحب کی یہ تجویز کہ الف ممدودہ کو آ کی بجائے [ا] لکھا جائے غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔

اردو اور ہندی میں تیرہ حروف علت ہیں جن کے بارے میں میں اپنے مضمون "اردو آوازوں کی صحیح تعداد" مشمولہ نیا دور ستمبر ۱۹۶۱ء میں تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ ان تیرہ[۱۳] حروف علت میں دس ہندی کے مشہور حروف علت ہیں۔ باقی تین حسب ذیل ہیں:

خفیف اِے — سہرا۔ محنت۔ بہتر۔ مہتا۔ عوض۔ واقعہ

خفیف اَے — دہن۔ بہن۔ کہنا۔ نہر۔ محل۔ محفل۔ بہن

خفیف اُو — کہرام۔ جہلم۔ محسن۔ محلہ۔ عہدہ۔ اہمہ

ان کے لئے بھی اعراب وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ حیات اللہ انصاری صاحب نے اپنے مضمون "کشمیری زبان کے لئے ایک رسم الخط" مطبوعہ اردو ادب دسمبر ۱۹۵۸ء میں ان تینوں کے لئے علامتیں تجویز کی ہیں جن کی میں سفارش کرتا ہوں۔ ان میں زبر، زیر اور پیش کے آخری سرے کو خفیف سا داہنی طرف کھینچ دیا گیا ہے:

خفیف اِے سہرا
خفیف اَے کہنا
خفیف اُو کہرام

کسی مجوز نے اس طرف توجہ نہیں کی کہ بعض ہندی الفاظ چھوٹی یِ یا چھوٹے ڈ پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کے لئے بھی نشانات تعین کرنے کی ضرورت ہے۔ میری تجویز ہے کہ آخری یِ کے لئے یِ کو نصف لکھا جائے مثلاً رشو، رگھوپتی۔ آخری ڈ کے لئے حرف صحیح کے اوپر پیش لگا دیا جائے جو چھوٹے واؤ کا قائم مقام ہے مثلاً اربندُ۔ گرُو۔ آخری یِ کے لئے میں نے زیر کی سفارش اس لئے نہیں کی کہ وہ اردو میں اضافت کا نشان ہے۔

اب ہمیں ذیل کے چھ طویل حروف علت پر غور کرنا ہے:

اِی - اِے - اَے - اُو - اُو - اَو

اردو میں ان کو دو آوازوں سے مرکب سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ ان میں سے ہر ایک مفرد آواز ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان میں نہ کہیں الف کی آواز پائی جاتی ہے نہ ے کی نہ و کی سب علیحدہ علیحدہ مستقل آوازیں ہیں۔ ایم اے حسن صاحب، غلام رسول صاحب اور ترقی اردو بورڈ پاکستان ان آوازوں کو کس طرح واضح کرنا چاہتے ہیں ذیل کی مثالوں سے اندازہ ہوگا:

حرف علت	حسن صاحب	غلام رسول صاحب	ترقی اردو بورڈ	راقم الحروف
اِی	جھیل	جھیل	جھیل	جھیل
اِے	کھیت	کھیت	کھیت	کھیت
اَے	بَیل	بَیل	بَیل	بَیل
اُو	طُور	طور	طُور	طُور
اُو	چُور	چور	چُور	چُور
اَو	دَور	دَور	دَور	دَور

اردو میں درمیانی یائے معروف اور یائے مجہول کو ظاہر کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ مثلاً شیر یعنی دودھ اور شیر یعنی

جیسی ہیں اعراب کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ ان کے امتیاز کے لئے میرے نزدیک ترقی اردو بورڈ کی تجویز موزوں ترین ہے حسن صاحب کا طریقہ نسبتاً اجنبی ہے۔ یے اور واو کو ترقی اردو بورڈ نے یا بالجزم اور واوٗ بالجزم کہا ہے حالانکہ بقیہ صورتوں میں بھی یا اور واو ساکن یعنی بالجزم ہیں۔ اس کے مقابلے میں غلام رسول صاحب کی اصطلاحیں یائے لین اور واوِ لین زیادہ مناسب ہیں۔ موخرالذکر اصطلاحوں کے بارے میں غلام رسول صاحب نے کئی موقعوں پر دعویٰ فخر کیا ہے کہ یہ ان کی ایجاد ہیں لیکن میں نے تقریباً پچیس سال پہلے ہائی اسکول کی کسی اردو یا فارسی قواعد میں ان کو پڑھا تھا اور تب سے میرے ذہن میں ان کا نام یائے لین اور واوِ لین نقش ہے۔ قواعد کا نام یاد نہیں آتا لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس کے مرتب غلام رسول صاحب نہیں تھے۔ اس کی علامت غلام رسول صاحب اور ترقی اردو بورڈ کے یہاں یکساں ہے معلوم نہیں کس نے کس سے لیا ہے۔ کیوں نہ ہم یائے لین اور واوِ لین دونوں کو مروجہ طریقہ پر ماقبل مفتوح لکھتے رہیں کیونکہ ہم نے ے اور و کی بقیہ دو صورتوں میں زبر کا استعمال کہیں نہیں کیا۔ واؤ معروف اور واؤ مجہول کے لئے بھی مروجہ املا برقرار رکھنے کے حق میں ہیں۔ غلام رسول صاحب کی تجویز کہ درمیانی اِ ے اور اُ ویہ زیر اور پیش حذف کر دیا جائے اس لئے غیر ضروری ہے کہ اردو میں عام طور پر تمام اعراب حذف کر دئے جاتے ہیں لیکن ہمارے ذہن میں ان کی ایک متفقہ شکل ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے۔ ابتدائی ریڈروں میں تمام اعراب کا ظاہر کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اب ہندی کے ان الفاظ کو لیجئے جن میں واوٗ ساکن حرف صحیح کے طور پر آتا ہے مثلاً اوتار۔ مادھو۔ کیشو۔ تانڈو۔ حسن صاحب کی تجویز ہے کہ ایسی صورت میں اس واوٗ سے قبل کوئی اعراب ہی نہ دیا جائے مثلاً औतार اَوتار۔ अवतार اوتار

لیکن یہ تو تشفی نہیں۔ اعراب کا فقدان اردو تحریر کا معمول ہے اس لئے اس فقدان کو ایک مخصوص آواز کی علامت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لئے بھی کوئی اعراب دینا ہوگا۔ یہاں پر ہم اسکے جزم کو واوٗ حرف صحیح کی علامت مان سکتے ہیں مثلاً اوْتار۔ اردو میں اس قسم کے واوٗ ساکن کا استعمال شاذ ہے اس لئے یہ اجنبی نشان ہمیں بہت کم استعمال کرنا پڑے گا۔

اب کچھ اور آوازیں لیں۔

ہندی	حسن صاحب	غلام رسول صاحب	ترقی اردو بورڈ	راقم الحروف
ष	ݜ	سٜشں	ݜ	ݜ
ण	ڻ	ݨ	ڻ	ڻ
ں	پانچ	پانچ	پانچ	پانچ
سک وغیرہ	سْکول	سِکول	سْکول	سْکول
प्रे	پْریم	پِریم	پْریم	پْریم

شمالی ہند میں ष کی آواز ہو بہو श کی طرح ہوتی ہے۔ مراٹھی اور دراوڑی زبانوں میں ان میں امتیاز کیا جاتا ہے جب ہمارے تلفظ میں श اور ष میں کوئی فرق ہی نہیں تو اس موہوم اور معدوم اختلاف کو ظاہر کرنا کیا معنی۔ اس لئے ष کے لئے ش سے علیحدہ کوئی علامت وضع کرنی تکلف بے جا ہی نہیں اسراف بھی ہے۔ اردو میں ण کی جگہ ن بولنا ہی فصیح ہے لیکن اگر کبھی کسی ضرورت کے تحت اس آواز کو ظاہر کرنا ہی مقصود ہو تو اس کے لئے ڻ بہترین علامت ہے کیونکہ اس طرح اس کا رشتہ دوسری معکوس آوازوں ٹ۔ ڈ۔ ڑ سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

چندر بندو [ں] میں حرف علت کو غنا دیا جاتا ہے۔ اس کو واضح کرنے کے لئے نون کے نقطے کے اوپر ہلال یا جزم بنانے کی بجائے اگر نقطے کے نیچے ہلال بنا دیا جائے تو ہندی سے مشابہت کی وجہ سے وضاحت بھی زیادہ ہو جائے گی اور کسی حد تک جگہ بھی کم لگے گی۔ مثلاً پانچ۔

پریم۔ سکول۔ استھان وغیرہ میں پہلی یا دوسری آواز کو نصف سمجھنا ایسی غلط فہمی ہے جو ہندی املا سے پیدا ہوئی ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر غلام رسول صاحب نے ایک اعراب نیم ـ ایجاد کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قبیل کے الفاظ میں پہلا حرف ساکن ہے جس کے لئے اردو بورڈ نے جزم کا استعمال بالکل صحیح تجویز کیا ہے۔ غلام رسول صاحب صوتیات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے معترض ہیں کہ اردو لکھاوٹ میں پہلے حرف کو ساکن نہیں لکھا جاتا۔ لیکن جب آپ ہندی اور انگریزی کے ایسے الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کرنا چاہتے ہیں تو سکون اول کی بدعت بھی گوارا کرنا پڑے گی حرف صحیح کے سکون کے لسانیاتی معنی یہ ہیں کہ اس کے آگے کوئی حرف علت نہیں۔ پریم۔ سکول۔ ڈرامہ وغیرہ میں شروع کے دو حروف صحیح کے بیچ کوئی حرف علت نہیں جس کی وجہ سے پہلا حرف ساکن اور دوسرا متحرک ہے۔ اس سکون کو ہم محض جزم سے ادا کریں گے۔ نیم کی ایجاد محض ایک لسانی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ (باقی)

آل احمد سرور

نثر کا اسٹائل کیا ہے؟

(گذشتہ سے پیوستہ)

چنانچہ نثر کی حسن بیان کے لئے وضاحت پہلی شرط قرار پائی۔ اس وضاحت کے راستے میں جو چیز بھی حائل ہو وہ عیب ہے۔ بیان میں ابہام یا اشکال، الفاظ کے کم اور خیال سے زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر خیال واضح نہیں ہے تو کبھی کبھار اسے آرٹ سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ واضح خیال اپنے ساتھ خود واضح زبان لاتا ہے۔ موج میں روانی ہو تو وہ خس و خاشاک کو بہائے جائیگی۔ واضح خیال تفکر سے پیدا ہوتا ہے۔ مڈلٹن مرے نے خلوص پر، اقبال نے خون جگر پر زور دیا ہے مگر میرے نزدیک خلوص اور خون جگر کافی نہیں۔ واضح خیال واضح تفکر زیادہ اہم ہے کہ انہیں میں خلوص کی کارفرمائی ہوتی ہے اور ذہن کی روشنی بھی۔ گو بات اس طرح کہی جائے گویا اس پر نازل ہوئی ہے اور یہی دنیا میں سب سے زیادہ اہم ہے۔

واضح خیال کا موزوں الفاظ میں اظہار اسٹائل ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں اسٹائل معنی کی موزوں تفصیل ہے۔ کروچے نے جب یہ کہا تھا کہ جب اظہار وجدان کی برابری کرے تو اسٹائل وجود میں آتا ہے" یا جب شوپنہاور نے کہا تھا کہ "اسٹائل خیال کا سایہ ہے" تو ان دونوں کی مراد بھی شاید یہی تھی۔ مگر خیال بھی پتلا یا گاڑھا ہو سکتا ہے۔ مثلاً آزاد کا خیال پتلا ہے" نذیر احمد کا گاڑھا" اور دونوں کی خامیاں اسی نکتے سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ سرسید اور حالی کے یہاں خیال واضح اور ان کے اظہار میں اعتدال اور موزونیت ہے یعنی نہ لفاظی ہے نہ ناہمواری۔ سرسید اور حالی کے اسلوب کی دیر میں مقبولیت بھی اسی وجہ سے سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ چاشنی اور چٹخارے کے عادی "اُبالی کھچڑی اور بے نمک سالن" کے اپنے مزے کو محسوس نہ کر سکتے تھے۔

اگر واضح خیال کا موزوں اظہار کافی ہے تو اس میں ندرت یا انفرادیت یا بانکپن کا کیا سوال ہے؟ یہیں شخصیت اسلوب کی بحث آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسٹائل ہی شخص ہے (Style is the man) حالانکہ شخصیت اسلوب میں سیدھے سادے طریقے سے جلوہ گر نہیں ہوتی وہ الفاظ کی چھلنی میں چھن کر آتی ہے۔ اور یہ الفاظ بھی ایک خاص سانچہ رکھتے ہیں۔ جو الفاظ ایک شخص استعمال کرتا ہے وہ ایک دور یا مزاج یا روایت کے بھی آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یعنی وہ انفرادی کے ساتھ اجتماعی خصوصیات بھی رکھتے ہیں۔ قدیم اردو میں ہندی کے نرم الفاظ زیادہ تھے۔ بیچ میں فارسی کی پرشکوہ ترکیبیں آئیں جن میں روانی بھی تھی اور شوکت بھی۔ موجودہ دور کی پیچیدہ زندگی سے عہدہ برا ہونے کے لئے ہمیں تمام علوم سے اور کئی زبانوں سے الفاظ لینے پڑتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو اچھا یا برا کہنا غلط ہے۔ یہ سمجھنا ہے کہ وہ کون اپنے دور کی روح کو زیادہ جذب کر سکا ہے اور کون کم۔

اس لئے اچھا اسٹائل وہ نہیں ہے جس میں کسی شخص کی من کی موج زیادہ نمایاں ہو بلکہ وہ جس میں اس کے دور کی روح اور اس روح کے امکانات کی زیادہ سمائی ہو۔ سرسید کا اسٹائل اسی لئے اپنے ہم عصروں کے اسٹائل سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور موجودہ دور کا اسٹائل سرسید سے زیادہ ترقی یافتہ۔ شخصیت کی بلند آہنگی اچھے اسٹائل کی مدھم موسیقی کے لئے مضر ہے، یہ دوسری بات ہے کہ کچھ لوگ شور زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ابوالکلام آزاد کا اسلوب اسی لئے نثر کا اچھا اسلوب نہیں ہے۔ فرد کی انا جب تک کائنات کی روح سے ہم آہنگ نہیں ہوتی، "میں" جب تک "ہم" نہیں بنتا اس وقت تک بلند پایہ اسلوب یا اعلیٰ ادب وجود میں نہیں آتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ الفاظ کا انتخاب اس طرح کیا جائے کہ ان کی زیادہ سے زیادہ امکانات واضح ہوں۔ مختلف الفاظ کی کھنک، ان کے لہجے کا فرق، ان کی خوشبو، ان کے متعلقات، ان کے رشتوں کا علم اسی وقت ہوتا ہے جب لکھنے والا الفاظ کے سرمائے پر عبور رکھتا ہو اور اس سرمائے پر عبور کے معنی اپنے دور کی تہذیبی فضا پر عبور کے ہیں۔ اسی لئے میں کم کے بجائے ہم کا مسئلہ اہم ہے۔

ادب میں بول چال کی بھی اہمیت ہے، مگر تحریر کی زیادہ ہے۔ بول چال کی زبان بکھرے ہوئے پھولوں کی طرح ہے۔ تحریر ان پھولوں کو ایک ہار میں پرو دیتی ہے یعنی اس زبان کو معیار، ہمواری، باقاعدگی، موزونیت، ضبط و نظم سکھاتی ہے۔ قصے کہانیوں میں بول چال سے کام لینا ناگزیر ہے اسی لئے وہاں محاوروں کا گذر زیادہ ہے مگر سنجیدہ اور علمی نثر محاورے یا سوئے ہوئے استعاروں کے سہارے کم اور خیال کے چراغاں کے سہارے زیادہ چلتی ہے۔ اسٹائل کی جو بھی تعریف کی جائے اس کے دامن میں سنجیدہ نثر کے تمام پہلوؤں کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش ہونی چاہئے۔ اس کے معنی کتابی زبان کے نہیں کیونکہ لفظ کتابی میں بول چال کی بے ساختگی سے دوری اور اصطلاحات کی خاصی بدپرہیزی کا پہلو آگیا ہے۔ مگر نثر کا اچھا اسٹائل بڑی حد تک اجتماعی، معیاری اور اسی لئے ایک حد تک قطعی ہوتا ہے۔ ایک لفظ ہٹا دیا جائے تو مفہوم کس طرح بدل جاتا ہے۔ یہ بات اس نکتے سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کیوں کر شاعری میں انفرادی اور نثر میں اجتماعی اجتماعی آہنگ زیادہ ضروری ہے۔

اُردو والوں کے اعصاب پر پہلے شاعری اور پھر غزل سوار رہی۔ شاعری رمز و ایما کا اور غزل نے انتشار ذہنی کا خوگر بنا دیا۔ ادب لذت تھا یا نجات، بصیرت کم تھا۔ نثر کا ارتقا بہت دیر میں ہوا اور شاعری کے برگد تلے اس کا نازک پودا کچھ سکڑا سمٹا رہا۔ جب ادب کی چمن بندی ہوئی اور سوکھی شاخیں کاٹی گئیں تو سورج کی دھوپ نے نثر کے پودے کو بھی توانائی عطا کی مگر برگد کے عظیم سائے میں نثر کے چھوٹے سے پودے کو کون دیکھتا؟ اسی لئے اب تک ہمارے بیشتر پرانے پیمانے شاعری کے ہیں نثر کے نہیں اسٹائل کی بحث میں بھی خیال کی توانائی اور تخیل کی صورت گری کو

زیادہ اور محض شوخ وشنگ ترکیبوں کو کم ملحوظ رکھنا ہوگا۔ حسن موزونیت اور اس کے مجموعی تاثر کا دوسرا نام ہے۔ مجموعی تاثر کے معنی یہ ہیں کہ کوئی جز علیحدہ سے اپنی توجہ منعطف نہ کرائے، بلکہ ایک دوسرے سے مل کر جنت نگاہ بن جائے۔ اگر کسی کی تحریر میں تراکیب، استعارے، انا کی بازی گری یا علمیت کی نمائش یا مقصدیت اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے تو یہ اسٹائل کی خامی ہے یہ دوسری بات ہے کہ مجموعی تاثر کے باوجود کہیں کہیں ان میں سے کوئی چیز بھی دخل پا جائے۔ ہارڈی فضا کی روح کو اسیر کر لیتا ہے گو بعض اوقات الفاظ کا انتخاب اچھا نہیں کر سکتا۔ بہت سے لکھنے والے صحیح نثر لکھتے ہیں مگر وہ کیفیت یا تاثر پیدا نہیں کر سکتے یہ ماہرین ہیں صاحب طرز نہیں ہیں۔ جس طرح ہر کتاب خواں صاحب کتاب نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر لکھنے والا صاحب طرز نہیں کہا جا سکتا۔ نہ ادب کے میدان میں ہر ساحر کو پیغمبر اور ہر پیترے باز کو تیغ زن کہا جاتا ہے۔ میرے نزدیک تو اسٹائل وہ تلوار ہے جو:

کر جائے کام اپنا لیکن نظر نہ آئے

جس طرح اس بھرپور وار میں پھرتی اور چابک دستی ہوتی ہے اسی طرح اچھے طرز یا اسٹائل میں ایک ایسی سریع النفوذ اور برق اثر کیفیت ہوتی ہے کہ جس میں طاقت، حرارت اور تیزی مل کر قیامت بن جاتی ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے خیال، الفاظ اور دونوں کے رشتے کا مناسب احساس کہہ لیں۔ مڈلٹن مرے نے اسی کو پُرجوش ادعا (Effectiveness of assertion) کہا ہے۔ اسٹائل گویا کوہ ندا کی وہ آواز ہے جس کے سنتے ہی سوائے لبیک کہنے کے کوئی چارہ نہیں۔ یہاں عظمت حسن ہے اور حسن عظمت۔ یہ الفاظ کی فوج پر انسان کی فتح ہے اور اسی لئے لازوال اور غیر فانی ہے۔ ہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ خیال یا تصور یا عقیدہ یا نظریہ کافی نہیں، اس کا ادبی اظہار ضروری ہے۔ جو لوگ یہ کہتے تھے کہ غالب کے یہاں خیال ہے اور ذوق کے یہاں زبان، وہ ادب میں خیال اور زبان کے مل کر ایک سنگیت پیدا کرنے کی خاصیت کو نظر انداز کرتے تھے۔ وہ غالب اور ذوق کے فرق کو سطحی طور پر واضح کرتے تھے اور ادبی اسلوب کے جامع مفہوم کو نظر انداز کرتے تھے۔

میرے نزدیک اسٹائل کی یہ تعریف کہ "وہ واضح خیال کا موزوں اور اسی لئے منفرد اظہار ہے" بڑی حد تک جامع ہے۔ اس میں فطری اور مصنوعی زبان کی بحث بھی اٹھائی جا سکتی ہے کیونکہ تحریر کی زبان، جو ادب کی بنیاد ہے، بڑی حد تک مصنوعی ہوتی ہے۔ مصنوعی سے شرمانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ انسان کی تہذیب کا وشوں کا سارا سلسلہ سرتاسر مصنوعی ہے لفظ مصنوعی میں شعوری پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس شعور کے ارتقاء میں زندگی کے سارے پیچ وخم آ جاتے ہیں۔ اسی لئے اچھا اسلوب بے ساختہ معلوم ہوتا ہے مگر اس کے پیچھے صدیوں کے ذہن کا خیرا اور ایک شخصیت کی بصیرت کی ساری روشنی اور گرمی ہوتی ہے سادگی و پرکاری یا سہل ممتنع کی اصطلاحیں اسی وجہ سے معنی خیز ہیں۔ مگر ہم لوگ بیشتر یک رخا ذہن رکھتے ہیں۔ اسی لئے مجموعی تصور سے گھبراتے ہیں اور ہر چیز کو اس کی انتہائی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے میں نے واضح خیال کے مناسب اور ایسے منفرد اظہار پر زور دیا، ورنہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی ہر کوشش خواہ کتنی ہی قابل قدر ہو، مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ یہ حقیقت تک ایک اور قدم ہو سکتی ہے، پوری حقیقت نہیں ہو سکتی۔

اگر نثر کے اسٹائل کی بحث میں ان بنیادی پہلوؤں کو واضح کر دیا جائے تو قدرتی طور پر کچھ اچھے اسالیب کی مثالوں پر بھی غور کرنا پڑے گا۔ اور ان میں سے ہر ایک کی خوبی یا خامی بھی واضح کرنی پڑے گی۔ مثلاً سرسید، حالی اور عبدالحق کے اسلوب کی موزونیت کو صرف اس بنا پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کچھ لوگوں کے نزدیک جمالیاتی نقطۂ نظر سے کچھ دو اور دو چار قسم کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ یعنی آپ اس پر وجد نہیں کر سکتے ہاں اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادھر یہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سرسید، حالی اور عبدالحق سے یہ مطالبہ کہ وہ آپ کو وجد میں لائیں غلط ہے۔ ان کے لئے موزوں اسلوب وہی ہے۔ آزاد کو مہدی افادی نے اردوئے معلیٰ کا ہیرو کہا ہے مگر یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ ان کا اسلوب افسانۂ یاران کہن کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ گویا نیرنگ خیال اور آب حیات کے نگارخانے میں جو آزاد کا اسلوب ہے وہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ مگر دربار اکبری یا سخندان فارس جیسی کتابوں میں صراط مستقیم سے ہٹا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا آزاد حالی سے بہتر نثر لکھتے ہیں؟ اس کا جواب ایمانداری سے دینے کی کوشش کی جائے تو بات خود بخود واضح ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے ناول اور افسانے کے اسلوب، مضمون نگاری کے اسلوب، علمی زبان کے اسلوب میں فرق ضرور ہوگا۔ مگر ان اسالیب کو نثر کی بنیادی خصوصیات پوری کرتی ہوں گی۔ اسی وجہ سے ابوالکلام کے تذکرے کی زبان نثر کے اچھے اسلوب کی نشان دہی نہیں کرتی۔ ہاں قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کے خطوط میں جو طرز برتا ہے، وہ وہاں موزوں ہے مگر کرشن چندر کے مقابلے میں عصمت اور منٹو افسانے کے اسلوب بیان سے زیادہ واقف ہیں۔ موزوں اظہار کی شرط پر اتفاق ہو جائے تو مناسب موقعوں پر ہلکے اور گہرے رنگوں کی جگہ نکل آتی ہے اور تصویر میں رنگ بھی گڈمڈ نہیں ہوتے۔

صدف ضیین

ڈاکٹر رائے کی انصاف پسندی

صرف مغربی بنگال ہی نہیں پورے ہندوستان کے اردو دوست یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ مغربی بنگال میں اردو کو بنگلہ کے ساتھ سرکاری زبان کا درجہ دینے کے سوال پر انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے سکریٹری اور وزیر اعلیٰ ڈاکٹر ایس ایس رائے کے درمیان جو بات چیت ۲۶ فروری کو ہوئی تھی وہ امید سے کہیں زیادہ اطمینان بخش ثابت ہوئی۔ وزیر اعلیٰ نے اصولی طور پر یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ مغربی بنگال میں جہاں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد موجود ہو وہاں اردو کو بنگلہ کے ساتھ سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے گا۔

وزیر اعلیٰ نے اس سلسلے میں حالیہ مردم شماری کی رپورٹ کا انتظار کرنے کو کہا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ مردم شماری کے ریکارڈ کے مطابق مغربی بنگال کے کون کون سے علاقے ایسے نکلتے ہیں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل ذکر تعداد موجود ہے۔ مردم شماری کی رپورٹ غالباً اسی سال سامنے آ جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ مردم شماری کے ریکارڈ کو ایک دم صحیح نہیں کہا جا سکتا اور خاص طور سے زبان کے خانے میں اندراجات کا مسئلہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کا تلخ تجربہ اردو والوں کو ہو چکا تھا۔ اسی لئے ۱۹۷۱ء میں وہ کافی چوکنا تھے اور انھوں نے اپنی سی کوئی کوشش بھی اٹھا نہیں رکھی کہ اس بار زبان کے خانے میں صحیح اندراجات ہوں۔ پھر بھی مردم شماری کے زمانے ہی میں یہ شکایتیں چاروں طرف سے سننے میں آ رہی تھیں کہ زبان کے اندراج میں بعض جگہ دھاندلی سے کام لیا جا رہا ہے۔ بتانے والے کچھ بتاتے ہیں لکھنے والا کچھ اور لکھ لیتا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے مردم شماری کے کارپردازوں تک شکایتیں پہنچائی بھی تھیں۔ مگر ان کے ازالے کی کوئی صورت نہیں نکل سکی۔ صرف لفظی اطمینان دہی کافی سمجھی گئی۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ حالیہ مردم شماری کی رپورٹ سو فیصدی درست ہوگی اور اس میں تمام اردو بولنے والوں کا صحیح ٹھیک اندراج ہوگا پھر بھی مردم شماری کے دنوں میں جس مستعدی اور چوکسی سے کام لیا گیا تھا اسے دیکھتے ہوئے امید کی جا سکتی ہے کہ اردو کی پوزیشن یقیناً کچھ بہتر نظر آئے گی۔ اگر غلط اندراجات کی وجہ سے اس بار اردو کو ان تمام علاقوں میں اپنا جائز مقام نہ مل سکا جو اس کا حق ہے۔ تب بھی ایسے کئی علاقے نکل آنے کی امید ہے۔ جہاں وزیر اعلیٰ ڈاکٹر رائے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے اردو کی سرکاری اہمیت تسلیم کر سکیں گے۔

مراسلات

اردو والوں کے لئے لمحۂ فکر و غور

انگریزی رسم خط کے سلسلے میں جو نئی تحقیقات ہم پہنچائی گئی ہیں اور جسے جیمس پٹمین نے ARA کی شکل میں پیش کر کے انگریزی زبان کی صوتی اور لسانی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ یقیناً اردو خواں طبقہ کے لئے غور و فکر کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ انگریزی سوسائٹی جس قدر اپنے طرز معاشرت اخلاق و عادات میں سخت گیر ہے اس کا اندازہ تقریباً سبھی ہندوستانیوں کو اچھی طرح ہے۔ مگر ان سخت گیریوں کے باوجود انھوں نے رفتار زمانہ اور نئی تحریکوں کو پیش نظر رکھ کر ایک مناسب قدم اٹھانے کی کوشش کی ہے جو انگریزی تحریر کو اور آسان کر دے گا۔ جب کہ انھیں یہ خطرہ لاحق نہیں کہ اگر یہ ترمیم نہ کی گئی تو انگریزی زبان فنا ہو جائے گی اور جبکہ انگریزی تقریباً تمام دنیا کی لنگوا فرانکا سمجھی جاتی ہے۔

انگریزی کے اس نئے تجربے کو پیش نظر رکھ کر اردو والے اپنے رسم الخط کی دقتوں کو دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے کیا انگریزی کے اس نئے ٹائپ سے ان کے دل میں اپنے سخت گیر نظریے کو چھوڑ دینے کا احساس پیدا نہ ہوگا؟ ملک کی موجودہ حالت اور اردو کے قبولیت کی دقتوں اور دشواریوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی فنا اور بقا کا مسئلہ بھی درپیش ہے اس وقت شتر مرغ کی طرح ریت میں سر گاڑ لینے اور یہ سمجھ لینے سے کہ ہم محفوظ ہیں کام نہیں چل سکتا۔ صفحۂ کاغذ پر جس طرح چاہئے خوشیوں کا اظہار کر لیجئے مگر یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عمل اور امکانات کے میدان میں اردو اس تیزی سے ہٹ رہی ہے کہ کچھ دنوں میں اردو خواں اس طرح ڈھونڈھنے پڑیں گے جس طرح آج کبھی جب کوئی فارسی کی دستاویز مل جاتی ہے تو فارسی داں کی تلاش ہوا کرتی ہے ہمارے گھروں کے بچے اردو بالکل نہیں جانتے۔ اسے ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ اس سلسلے میں کسی ثبوت یا وضاحت کی ضرورت نہیں۔ جو بھولے بھٹکے اردو پڑھتے لکھتے ہیں انھیں منجملہ اور دقتوں کے رسم الخط کی خامیاں پریشان کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں چند تبدیلیوں کے مان لینے میں کیا نقصان ہے۔

کیا یہ ایک معقول بات ہوگی کہ اردو کے چند پڑھنے والے پریشان ہو کر اردو پڑھنا چھوڑ دیں، مگر ہم اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے رہیں؟ ابھی رسم الخط کی یک لخت تبدیلی پر تو لوگ چراغ پا ہو جائیں گے (حالانکہ اردو کتابوں کے ہندی ترجمے کرا کے اپنی شکست کا وہ اعتراف کر رہے ہیں) مگر س، ث، ص، ذ، ز، ظ، ط، ت، ا، ع، ہ، ح کے لئے ایک آسان حرف اور آواز مقرر کر لینے میں ہمیں اپنی ہزیمت کا کیوں احساس ہوتا ہے۔ ہم نے بہت سے بت توڑے ہیں۔ الفاظ کے اعراب ہم نے بدلے، شکلیں ہم نے بدلیں، معنی اور موقع استعمال ہم نے بدلا۔ عجیب و غریب ترکیبیں الفاظ کی ہم نے بنائیں پھر آخر اس معمولی سی تبدیلی میں کون سی ایسی بات ہے جسے ہم اختیار کرنے سے گھبراتے ہیں خاص طور پر اردو کے ایسے گاڑھے اور جانگسل موقع پر۔ مجھے اس بات کا احساس اچھی طرح ہے کہ اس تجویز کے ساتھ (گو یہ تجویز بارہا پیش کی جا چکی ہے اور نئی نہیں ہے) فوراً عربی النسل اور ایرانی نژاد الفاظ کا جھگڑا اور ان کے معانی کا سوال اٹھ کھڑا ہوگا اور علمی تبحر کا انکشافات و اظہار زبان کشی پر غالب آنے کی کوشش کرے گا مگر کیا یہ مناسب ہوگا کہ محض چند لوگوں کا یہ احساس مجروح نہ ہو چاہے اردو زبان ختم ہو جائے۔ چند لوگوں کی ہٹ دھرمی، غلط علمی روایات کو اپنائے رہے چاہے ہم نے بارہا بہت ساری روایتیں بدلی ہوں۔ ابھی زیادہ دن کی بات نہیں کہ ہم نے تحریر میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ 'اوس' 'اون' کو 'اُس' اور 'اُن' کیا۔ طوطا، ذردی، سنزاد کو توتا، زرد اور نژاد کیا۔ ٹ، ڈ، ڑ کو ٹ، ڈ اور ڑ کیا۔ 'ا' 'و' کو 'آ' 'وٗ' کیا۔

پھر یہی نہیں کیا ہم نے 'افراط و تفریط' کو 'افرا تفری' 'جمن' کو جمن (ایک خاص موقع پر) 'قابل' کو 'قابلی' 'خریدیا' کو خریدا 'بیعہ' سے بیا اور 'کھدائی' کے وزن پر 'بیعائی' اور 'پھر بیائی' اور بھی برائے تبعانہ 'فوق البھڑک' 'ہیئۃ السمن' ہیئت السمن شاعر غزہ (جبکہ غزہ مونث ہے) جیسی تبدیلیاں نہیں کیں یہ تمام تبدیلیاں ہم نے کی ہیں اور کرتے رہیں گے۔ کیونکہ معقول اور ترقی کی طرف لے جانے والی تبدیلی اختیار کر لینا اردو کے خمیر میں شامل ہے۔ اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ پھر 'سوء ظن' اور 'سوئے زن' 'فترت' اور 'فطرت' 'اصرار' اور 'اسرار' (جبکہ الف بالکسر بھی، اعراب نہ ہونے کی وجہ سے پڑھے جانے کے امکانات ہیں اور بہت سے لوگ پڑھ بھی لیتے ہیں) 'ظرف' اور 'زرف' 'طرہ' اور 'ترہ' (ترکاری) 'صورت' اور 'صورۃ' 'معانی' اور 'معنی' 'اتم' اور 'عظم' اور اسی طرح کے بہت سارے الفاظ میں کیسے فرق پیدا کریں گے۔ اس کا جواب بہت آسان ہے جس کا ثبوت انگریزی ادب میں جا بجا مل بھی جاتا ہے کہ موقع استعمال ہمیں سب کچھ بتا دیتا ہے۔ اس لئے اس تبدیلی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اسے مخض 'ہوا' بنا کر پیش کر دینے سے البتہ روز بروز اردو کے فنا ہونے کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔

ایک صورت اور سمجھ میں آتی ہے کہ ملک کے چند سوجھ بوجھ والے ادیب ایک جگہ اکٹھا ہوں اور سر جوڑ کر کچھ ایسے الفابٹ (Alphabet) تیار کریں جنھیں متفقہ طور پر سب تسلیم کر لیں اور ابتدائی کتابیں انھیں حروف میں چھاپی جائیں جنھیں انجمن ترقی اردو یا اور کوئی ادارہ تیار کرے اور پھر مبتدی اسی کے ذریعہ اپنی تعلیم شروع کریں۔ اس طرح ایک دقت پھر پیدا ہو سکتی ہے کہ ہماری موجودہ کتابوں اور رسم الخط کا کیا ہوگا۔ اس کے لئے

یہ ہے کہ شروع میں تو ہندی انھیں نہ سمجھ سکے گا مگر جب اسے اردو کی کچھ لیاقت ہوجائے گی تو ان کتابوں کے سمجھنے میں پھر اسے کوئی دقت نہ ہوگی۔ افسوس یہ ہے کہ اب اردو کا معاملہ ایسے موڑ پر پہنچ چکا ہے جس کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ زیادہ حیص بیص کا موقع نہیں۔ پھر بھی ہمارے ادبی سخت جان اپنی بات پر اڑے ہیں۔ انھیں کون یہ سمجھائے کہ زبان کا رسم الخط سے کوئی بہت بڑا واسطہ نہیں ہوا کرتا بلکہ اسے آسانی سے سمجھنے کا یہ زینہ ہوا کرتا ہے۔ زبان کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ رسم الخط کوئی بھی اختیار کر لیجئے۔ ہندی والوں میں جو افراتفری ہے اور شمالی وجنوبی کی آویزش، ہوسکتا ہے کہ یہ بھی کسی نئے رسم الخط پر پہنچ کر اپنے اختلافات ختم کردے۔ خیر اس وقت ہمیں اس سے کوئی خاص واسطہ نہیں۔

میں انجمن کے اراکین کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں جلد قدم اٹھائیں۔ جذباتی طور پر کوئی مسلم کب تک اپنے بچوں کو اردو پڑھا سکے گا ——— ایسی اردو جو دیوناگری رسم الخط کے مقابلے میں مشکل رسم خط رکھتی اور جس کا ہندوستان کی روز بروز مقابلاتی زندگی میں کوئی درجہ یا واسطہ باقی نہیں رہ گیا ——— عام آدمی صرف دو اور دو چار میں سوچتا ہے۔ اگر اردو اس کے کام نہ آئی تو وہ کب تک اس کی طرف متوجہ رہے گا۔ اتر پردیش کا لینگوج کمیشن اور کشمیر میں اردو محض بہلاوے کی باتیں ہیں۔ کشمیر میں ایک طرف سرکاری زبان اردو ہے۔ دوسری طرف چور دروازوں سے کشمیریوں کو اس بات کا احساس دلایا جا رہا ہے کہ تمھاری زبان اردو نہیں کشمیری ہے نئی وزارت کے نئے لنگوج کمیشن سے ہمیں امید ہو سکتی تھی مگر اس کی دو بیٹھکیں ہمیں پھر ناامیدی کی طرف بہائے لے جارہی ہیں۔"

(ڈاکٹر محمد عقیل)

مرزا محمد رفیع سودا کا خود نوشت قلمی دیوان!

اس عنوان سے ایک خبر ہماری زبان (یکم جنوری ۱۹۷۱ء) قومی زبان کراچی اور بعض دوسرے اخبار و رسائل میں شائع ہوئی تھی اس خبر کے شائع ہوتے ہی اس دیوان کی خریداری اور اشاعت کے سلسلہ میں ہندو پاک سے متعدد خطوط مختلف اداروں اور افراد کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔

ابھی قریب تین ماہ گذرے کہ مجھے ایک ادبی محفل میں شرکت کرنے کی غرض سے لکھنؤ جانا پڑا ——— میرا اٹیچی بیگ (جس میں دیوان سودا سے متعلق تمام خط و کتابت کا فائل بھی تھا) وہ لکھنؤ کے اس سفر کی نذر ہو گیا جس کا بے انتہا جد وجہد کے باوجود بھی اب تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس لئے میں ان تمام حضرات سے گذارش کروں گا جنھوں نے دیوان سودا کی خریداری اور اشاعت کے سلسلہ میں مجھے خطوط لکھے تھے۔ وہ ایک بار پھر مجھے مندرجہ ذیل پتہ پر خط لکھنے کی زحمت گوارہ فرمائیں جس کے لئے میں ان تمام حضرات کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

اور جن جن حضرات کو اس سلسلہ سے کچھ دلچسپی ہے یا اس کے متعلق کچھ دریافت طلب امور ہیں وہ بغیر کسی تکلف کے خط لکھ سکتے ہیں مجھے جواب دینے میں کوئی عذر نہ ہوگا بلکہ خوشی ہوگی۔

خان توفیق احمد خاں جعفری
۲۳۶ گھیر مٹھو اسٹریٹ۔ بریلی (یو۔پی)

ہفتہ وار "پیام جنوب" کا اجرا

شمس العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم ومغفور کی علمی وادبی کی یادگار میں ایک ہفتہ وار اردو اخبار "پیام جنوب" شہر مدراس سے شائع ہو رہا ہے جس میں بلند پایہ علمی، ادبی اور دینی مضمونوں اور تحقیقی مقالوں، سنجیدہ تنقیدوں، طنز و ظرافت آمیز شاہکاروں، دلچسپ افسانوں اور حیات آفریں نظموں اور غزلوں کے علاوہ قومی، ملکی اور عالمی مسائل پر سیر حاصل بحثیں، ملکی اور غیر ملکی فلموں پر بے لاگ تبصرے اور جدید سائنسی تجربات اور دنیا بھر کی دلچسپ معلومات کے خلاصے بھی شائع ہوا کریں گے۔ اس اخبار کے ذریعہ ہماری سب سے بڑی کوشش یہ رہے گی کہ جنوبی ہند کے ان تمام اردو ادیبوں کے شاہکاروں کو منظر عام پر لایا جائے جو ابھی تک گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ زبان ابنائے وطن کی متحدہ کوششوں کا سرمایۂ حاصل ہے۔ ملک کی مختلف قوموں نے اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کی ہے یہ زبان اردو قومی یکجہتی کی زندہ و پائندہ مثال ہے۔ ایسی زبان کی نشو و نما اور ترویج و اشاعت میں حصہ لینا ایک بہت بڑی ملکی اور ادبی خدمت ہے۔ ملکی اور قومی تہذیب و ثقافت کا جو بیش بہا خزانہ اس زبان میں موجود ہے۔ اس کی مثال شاید ہی ملک کی اور کسی زبان میں مل سکے۔ لہٰذا ملک کی مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور روایتوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اردو زبان کی تعلیم اور اس کی اشاعت از حد ضروری ہے۔ ہمارا مصمم ارادہ ہے کہ اس اخبار کو ہر حالت میں زندہ رکھا جائے اور اس کے ذریعہ ادب کی بڑی سے بڑی خدمت انجام دی جائے۔ خوشی کا مقام ہے کہ آجکل جنوبی ہند کی فضا اشاعت اردو کے لئے ایک حد تک سازگار بنتی جارہی ہے۔ اگر ہمارے اردو اخبارات و رسائل کو آپ جیسے علم دوست حضرات کی سرپرستی اور مالی تعاون حاصل ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ چند روز زندہ رہنے کے بعد یہ بند ہو جائیں۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ "پیام جنوب" پابندی وقت کے ساتھ ہمیشہ شائع ہوتا رہے گا بشرطیکہ آپ کا مالی اور قلمی تعاون اس اخبار کو حاصل ہوتا رہے۔

منیجر پیام جنوب
ڈاکٹر عبدالحق چیمبر گرسنٹ بلڈنگ
۷ دریچپا چیٹی اسٹریٹ مدراس ۲

پبلشر پرنٹر ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا